ہماری ذمہ واریاں
اور
ہماری مشکلات

(فرمودہ ۸ر اپریل ۱۹۲۱ء)

حضور نے تشہد و تعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا۔

میرے دل میں تھا کہ جماعت کے متعلق بعض ضروری باتیں آج کے خطبے میں بیان کروں۔ لیکن صبح سے میرے ناک اور حلق میں تکلیف ہے۔ اس لئے آج میں اگرچہ تفصیل سے بیان نہیں کر سکوں گا مختصراً بیان کرتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کئی بار بتایا ہے۔ ہماری ذمہ واریاں دوسروں سے بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ ہماری مثال اس ڈاکٹر کی ہے۔ جس کو علاج کے لئے ایک بڑی جماعت پاگلوں کی سپرد کی جائے۔ ایک سرکاری پاگل خانے ہوتے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر پر بوجھ نہیں ہوتا۔ وہاں وہ اپنے فرض کو حکومت خیال کرتے ہیں۔ مارپیٹ بھی لیتے ہیں۔ ضرورت ہوئی تو دوا بھی دیتے ہیں مگر ان کے علاوہ ایک اور پاگل خانے یورپ اور امریکہ میں ہوتے ہیں۔ جہاں امراء اپنے پاگل رشتہ داروں کو علاج کے لئے رکھتے ہیں۔ اور وہ پاگل خانے تجارتی طور پر ہوتے ہیں۔ وہاں ڈاکٹروں کو معقول معاوضہ ملتا ہے۔ مگر ڈاکٹروں کی ذمہ واری نازک ہوتی ہے۔ کیونکہ جتنے مریض شفا پائیں ان کی شہرت کا مدار ان پر ہوتا ہے۔

چونکہ ایسے مریض کی عقلی حالت اچھی نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کو دوا دیں تو وہ کہتا ہے کہ تندرست ہوں مجھے بیمار کون کہتا ہے۔ وہاں ایک شرط یہ بھی علاج میں ہوتی ہے کہ مریض کو یقین

ولایا جائے۔ کہ وہ بیمار نہیں تندرست ہے۔ جب ڈاکٹر کا یہ فرض بھی ہو۔ تو مریض کو دوا کیسے دی جائے۔ دوائی دو تو وہ کہتا ہے مجھے بیمار کہتے ہو۔ اور اگر نہ دیں تو علاج کیسے ہو۔ وہاں بڑی محنت اور ہوشیاری سے کام کرنا پڑتا ہے۔ یہی حال ہمارا ہے۔ پھر ایک اور فرق ہوتا ہے کہ ان کو مریض کے رشتہ دار تمام خرچ دیتے ہیں۔ یہاں ہمیں اپنے پاس سے ہی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ تو ہماری مثال تو ایسے ڈاکٹر کی ہے۔ جس کو کمرے میں بند کر دیا جائے اور مریضوں کو اس پر حاکم مقرر کیا جائے۔ اور ساتھ ہی حکم ہو کہ ان کا علاج کرو۔

پس ہماری ذمہ واریاں بڑھی ہوئی ہیں۔ ہمارے پاس سامان کم اور طاقت بھی بہت کم ہے۔ ذمہ واری کے مطابق نہ سامان ہے نہ طاقت۔ پھر باوجود اس حالت کے جو سامان بھی ہمیں میسر ہیں انہیں سے کسی ایک کو اگر ہم ترک کر دیں تو ہمیں کامیابی کی کیا امید ہو سکتی ہے۔

ہماری حالت یہ ہے۔ کہ اس میں بعض وقت ہم پر خطرناک آتے ہیں۔ اور تکلیف ہمیں گھیر لیتی ہے۔ اور سکھ کا کوئی پہلو ہمارے سامنے نہیں رہتا۔ دولت مند کے لئے ہر وقت آرام نہیں۔ بیمار کے لئے ہر وقت تکلیف نہیں۔ اگر ہر وقت اس کی ایک سی تکلیف رہے۔ تو وہ فوراً مرجائے۔ اس پر تکلیف وقفوں کے ساتھ آتی ہے۔ اور اس طرح ایک مریض لمبے عرصہ تک زندگی پاتا ہے۔ اسی طرح ہم پر جو اوقات ہوتے ہیں۔ وہ بعض دفعہ اس قسم کے آتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں پامال کر دیں گے۔ لیکن پھر ہمیں آرام کا وقفہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ یا تو ہماری طرف سے ہوتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم کام کرتے کرتے تھک گئے ہیں یا خدا تعالیٰ کی طرف سے کہ وہ خیال فرماتا ہے کہ اب کام کرتے کرتے اس حد پر پہنچ گئے ہیں۔ کہ ہمیں آرام کی ضرورت ہے۔ بہرحال کسی طرف سے جو آرام ہمیں ملتا ہے۔ وہ سانس لینے کے لئے وقفہ ہوتا ہے۔ پھر جس کو تکلیف کا وقت کہتے ہیں۔ وہ اصل ذمہ واری کا وقت ہوتا ہے۔ ایسے ہی وقت میں سے ہم آج کل گذر رہے ہیں۔ کیونکہ ایک طرف کام کی حالت بڑھتی جا رہی ہے۔ اور ایک رو ہے جو چل رہی ہے اور طبائع میں ایک جوش ہے جو لوگوں کو ہماری طرف متوجہ کر رہا ہے اور ہندوستان کے ایسے طبقہ میں جوش ہے جس میں پہلے نہ تھا۔ اور اسی طرح غیر ممالک میں بھی ایک لہر چل رہی ہے باہر سے خطوط آتے ہیں۔ ان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

امریکہ سے ایک حبشی ولایت میں آیا ہے۔ وہ افریقہ کا باشندہ ہے۔ اور اس نے اپنی تمام قوم میں دورہ کیا ہے وہ مذہباً" عیسائی تھا۔ اور ولایت میں آکر مسلمان ہو گیا ہے۔ امریکہ میں حبشیوں کی بہت سی آبادی ہے۔ جو دو کروڑ کے قریب یعنی پنجاب کی آبادی کے برابر ہے۔ جب یورپ کے لوگوں نے امریکہ میں نو آبادیاں قائم کیں۔ اور ان کو مزدوروں کی ضرورت پڑی۔ تو سفید رنگ کے

مزدور چونکہ زیادہ مزدوری مانگتے تھے۔ اس لئے مزدور بہم پہنچانے کا یہ طریق اختیار کیا گیا کہ زبردستی افریقہ کے حبشیوں کو پکڑتے تھے۔ اور ان سے بیلوں کی طرح جو کام چاہتے تھے لیتے تھے۔ اور ان کا قصور محض یہ ہوتا تھا کہ کمزور ہوتے تھے۔ اور پکڑنے والوں کا حق یہ تھا۔ کہ وہ طاقتور تھے۔ ان غلاموں پر بڑے بڑے مظالم ہوتے تھے۔ آخر ایک عورت نے ایک ناول لکھا۔ جس میں بتایا کہ کس طرح ان حبشیوں پر ظلم ہوتے ہیں۔ کس طرح ماں باپ کو بچوں سے اور بچوں کو ماں باپ سے جدا کیا جاتا ہے۔ اور کس طرح ان کو مارا اور زخمی کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس میں جذبات کو اپیل کی گئی تھی۔ کئی لاکھ کاپی اس کی چند دنوں میں نکل گئی اور آخر اس کو قانوناً" روکنا پڑا۔ مگر چونکہ وہ اپنا اثر کر چکا تھا اس لئے ملک میں دو پارٹیاں ہو گئیں۔ ایک وہ جو غلامی کے خلاف تھی۔ اور ایک تائید میں۔ دونوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ اور بڑے لمبے عرصے تک یہ جنگ رہی۔ جس میں غلامی کے حامی ہار گئے۔ اور مخالف جیت گئے۔ اور اس طرح ان غریب حبشیوں کو امریکہ میں آزادی ملی۔ ان میں ایک شخص افریقہ سے گیا۔ جو اپنی قوم کی فلاح کی تدبیریں سوچتا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ یہ سب لوگ عیسائیت چھوڑ کر مسلمان ہونے کو تیار ہیں۔ یہ تو یقینی نہیں کہ سب مان لیں گے۔ مگر یہ بعید از قیاس بھی نہیں۔ یہ کروڑوں کا میدان ہے ممکن ہے کہ جلد ہی لاکھوں اسلام میں داخل ہوں۔ اس کے لئے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ ادھر روس چاہتا ہے کہ اس میں آدمی بھیجے جائیں۔ تبھی وہ پیشگوئیاں پوری ہونگی جو وہاں کے متعلق حضرت مسیح موعود کی ہیں۔ کیونکہ وعدے کی پیشگوئی میں ایک حصہ انسان کا ہوتا ہے اور ایک خدا کا۔ انسان جب اپنا کام کرتا ہے تو باقی کا حصہ خدا خود پورا کر دیتا ہے۔ زار کا عصا چھینا جا چکا ہے۔ا۔ بخارا کے امیر کی کمان پڑی ہے۔ اب ضرورت ہے۔ کہ ہمارے آدمی جائیں۔ اور اپنے شکار میں مصروف ہوں۔ لیکن ہماری موجودہ حالت یہ ہے کہ تیس ہزار کے بل واجب الادا دفتر بیت المال میں پڑے ہیں۔ اور چالیس ہزار پہلے لے کر خرچ کیا جا چکا ہے۔ اور بعض لوگوں کو چار چار مہینوں کی تنخواہ نہیں ملی۔ اور تنخواہ نہ ملنے سے کئی لوگوں پر فاقہ کی نوبت گذر رہی ہے اور ان کی تنخواہ ماہوار اتنی ہے کہ جو باقاعدہ ملے تو ان کا گذارہ ہو سکتا ہے۔ ایسی حالت میں ہم باہر کس طرح کام کر سکتے ہیں۔ یہ ان تاریک وقتوں میں سے ایک ہے جن کے لئے حافظ نے کہا ہے۔ ؎

شب تاریک و بیم موج و گرداب چنیں حائل

چاروں طرف ظلمت ہے۔ لیکن ادھر دنیا ہمیں بلا رہی ہے۔ یہ ایک صدمہ ہے۔ اور نہایت دردناک حالت ہے اس وقت ہماری ایسی حالت ہے کہ بچہ مصیبت میں ہے ماں کو بلاتا ہے۔ مگر ماں مجبور ہے کہ اس کی مدد نہیں کر سکتی۔ اس حالت سے ایک خوشی بھی ہوتی ہے۔ اور ایک صدمہ بھی

ہے۔ خوشی اس سے ہے۔ کہ بچہ ماں کو پہچانتا ہے۔ اور رنج اس کا کہ ماں مدد نہیں کر سکتی۔ یہ بھی ظلمت ہے۔ کہ ہم ان کی مدد نہیں کر سکتے۔ اور لوگوں کی مخالفت کا طوفان بھی ایک ظلمت ہے۔ غرض ظلمت پر ظلمت ہے۔ اگرچہ یہ خطرے کی بات نہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس وقت یہ سوال ہمارے لئے موت اور زندگی کا سوال ہے۔ اس میں شبہ نہیں۔ کہ یہ خدا کا کام ہے۔ لیکن جب تک بندہ اپنا کام نہ کرے۔ اس وقت تک خدا اپنا کام نہیں کیا کرتا۔ دو کام خدا کے ہوتے ہیں۔ پہلے خدا اپنا کام کرتا ہے۔ پھر انسان کا کام آتا ہے۔ اگر یہ اپنا کام کرے۔ تو خدا دوسرا اپنا کام کر دیتا ہے۔ اس بات پر قرآن میں اتنا زور دیا گیا ہے۔ جس کی حد نہیں۔ قرآن کریم کی ہر سورت کے ابتداء میں اسی مضمون پر زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے **بسم اللہ الرحمن الرحیم** کہ اللہ کے نام سے شروع کرتے ہیں۔ جو پہلے رحمانیت کے ماتحت کام کر کے ہمیں ہر قسم کے سامان عنایت کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے ہمیں مسیح موعود دیا ہمارے لئے علم کے دروازے کھول دیئے۔ ہمیں ہدایت دی۔ یہ اس کی رحمانیت ہے آگے رحیم ہے۔ اس صفت کا تقاضا ہے کہ جب اس کے ماتحت خوب کام کریں گے تو پھر وہ ہمارے لئے کام کرے گا۔ پہلا کلام اس کی طرف سے ہو چکا ہے اب اگر ہم اس اپنے کام کو نہ کریں۔ تو وہ اپنا دوسرا کام نہیں کرے گا۔ سورہ فاتحہ کی ابتداء میں بھی اسی مضمون پر زور ہے۔ اور تمام قرآن میں بھی اس مضمون پر زور دیا گیا ہے۔

ہم میں اگر کرب ہوگا۔ ہم اگر اس کی طرف رجوع کریں گے۔ اور اس کے حضور گریں گے۔ تو وہ ہمیں اٹھائے گا۔ لیکن اگر ہم مطمئن ہو جائیں۔ اور اپنے آپ کو اس کے فضلوں کا جاذب نہ بنائیں۔ تو پھر ہم انعام نہیں پا سکتے۔ اور خدا اپنا کام جو ہمارے متعلق ہے نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ ہمیں اہل نہیں پائے گا۔

ہمارے اس کرب سے خدا کے علم میں اضافہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ تو جانتا ہے۔ بلکہ وہ دوسروں پر ظاہر کرتا ہے۔ اور ہماری حالت سے خود ہمیں مطلع کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ کہ ماں بچے کو مٹھائی دینے کے لئے ہاتھ بڑھاتی ہے۔ بچہ لینے کو لپکتا ہے۔ وہ ہاتھ ہٹا لیتی ہے۔ اگر بچہ مٹھائی لینے کے لئے ضد کرتا اور روتا ہے۔ تو دے دیتی ہے۔ اگر وہ ہاتھ نہ بڑھائے بلکہ اور طرف متوجہ ہو جائے تو وہ نہیں دیتی۔ کیونکہ جان لیتی ہے کہ اس کو ضرورت نہیں۔ پس ہمیں کرب پیدا کرنا چاہیئے۔ اور اس کے حضور گر کر طلب کرنا چاہیئے۔ تب اس کی مدد آئے گی۔

مسلمانوں سے یہی غلطی ہوئی۔ کہ وہ خدا کے حضور نہ جھکے۔ اور ان میں مصائب اور مشکلات کے وقت کرب پیدا نہ ہوا۔ اب ہمیں اس غلطی کا مرتکب نہیں ہونا چاہیئے۔ جب تک مسلمانوں کا پہلا حصہ اس حال میں رہا کہ جب دشمن کی طرف سے اسلام پر حملہ ہوا اور حالت نازک ہوئی۔ وہ

لوگ خدا کے حضور گرے تو خدا نے سنبھالا۔ اور ایسا بار بار ہوا۔ لیکن آخر میں مسلمانوں نے گمان کرلیا کہ خدا تو اسی طرح کیا کرتا ہے۔ اور اسلام کو بچا ہی لیا کرتا ہے۔ وہ مطمئن ہو گئے۔ اور اسلام انکے سامنے ڈوب گیا۔ اور انہوں نے خبر نہ لی۔ جب طوفان اٹھا تو انہوں نے کہا کہ ایسا ہوتا ہی ہے۔ اور بچاؤ کی فکر نہ کی۔ جہاز گرداب میں پڑا پھر انہوں نے توجہ نہ کی آخر ڈوبنے لگا۔ وہ ہنس پڑے کہ کیا ہوا ہم جانتے ہیں کہ جہاز نہیں ڈوبے گا۔ آخر جب وہ ذرا ٹس سے مس نہ ہوئے تو جہاز ان کی آنکھوں کے سامنے غرق ہو گیا اور انہوں نے کچھ نہ کیا۔

اس وقت ہم مشکلات میں ہیں۔ ہماری ذمہ داریاں بہت بڑھ رہی ہیں۔ اور تیس ہزار کے بل پڑے ہیں۔ اور چالیس ہزار پہلا قرض ہے۔ اور باہر مبلغوں کے بھیجنے کی ضرورت ہے۔ جب تک خاص جدوجہد نہ کریں گے۔ کام درست ہوتا نظر نہیں آتا۔ پس ہمیں ضرورت بہت دعاؤں کی ہے۔ اور بہت کوشش کی ہے۔

میں اس وقت مختصر بولنا چاہتا تھا مگر پھر بھی بہت بول گیا۔ اور میرے حلق میں تکلیف بڑھ گئی ہے۔ مگر آخر میں دوستوں کو کہتا ہوں۔ کہ تکالیف اور مصائب ہر طرف ہیں مگر ہمیں امیدیں بھی بہت ہیں۔ اور ہم کامیابی کو بھی گھر کے دروازے پر دیکھتے ہیں۔ دعا کرنی چاہیئے۔ کہ یہ محض لالچ ثابت نہ ہو۔ بلکہ خدا ہمیں ان کامیابیوں کے حاصل کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔

(الفضل ۲۱ر اپریل ۱۹۲۱ء)

ا؎ تذکرہ ص ۴۵۸